

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن منذ ۱۳۲۲

احادیث مکتبہ الامامیہ

از

افادات حضرت سید العلماء مدظلہ

تعارف

”اسلام کا نظریہ حکومت“

کے

موضوع پر سرکارِ سید العلماء مدظلہ کے دس بیانات جو مدرستہ العظیمین
 لکھنؤ میں ۱۳۹۶ھ میں ہوئے تھے وہ افسوس ہے کہ شارٹ ہینڈ رپورٹ
 کے نہ ہونے کی وجہ سے قلمبند نہ ہو سکے تھے مگر چونکہ فی زمانہ ان کی اشاعت
 کی انتہائی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اس لیے ان بیانات کا خلاصہ
 ہی سر دست شائع کرنے پر اکتفا کی جا رہی ہے۔ اگر ضرورت ہوگی تو انشاء اللہ
 آئندہ اس موضوع پر ایک بسیط کتاب بھی شائع کر دی جائے گی۔ اگرچہ
 ایک اعتبار سے یہ بھی مکمل ہے کیونکہ اس میں بھی جملہ ضروری اجزاء آگے
 ہیں یعنی خاکہ مکمل ہے صرف توضیحات و امثال کی ضرورت ہے
 اُمید ہے کہ افراد ملت اس رسالہ کی اشاعت کی جانب بھی خاص
 توجہ فرمائیں گے۔

خادم ملت

سید ابن حسین نقوی آنریری سکریٹری

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة على سيد الانبياء والمرسلين
والسلام الطاهرين

تمہید

حکومت کی ضرورت

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ نوع انسان کے لئے حکومت کا وجود ضروری بھی ہے یا نہیں۔ اگر مطلق العنان آزادی کا تخیل انسان کے لیے صحیح ہے تو یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ حکومت کی مطلق ضرورت ہی نہیں مگر انسان کا آزادی مطلق سے دوچار ہونا غیر ممکن ہے یہ کہنا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی اُس کا فطری حق ہے بالکل بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہے جب تک اس کے ساتھ یہ قید نہ لگائی جائے کہ "ناجائز قیود سے آزادی" اگر انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے تو اُس کے لئے اجتماعی قیود کی پابندیاں ناگزیر ہیں۔ حالانکہ حیوانات میں بھی بعض میں اجتماعی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں مگر انسان کو تو اس سے مفری نہیں ان ہی اجتماعی قیود کا نام "دستور العمل اور قانون" ہے اور اسی کی نافذ کرنے والی طاقت کا نام حکومت ہے۔

ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ اگر افراد خود احساسِ فرض رکھتے ہوں تو اُن کے لئے حکومت کی ضرورت نہ ہوگی مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے لئے صرف احساسِ فرض کافی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو صحیح نظام کی معرفت بھی ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ اُن سب کا نقطہ نظر مفادِ اجتماعی میں ایک ہی نقطہ تک پہنچے اور کوئی دالستہ یا نادالستہ دوسرے کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے اور یہ اُسی وقت ہو سکے گا جب وہ پوری جماعت فکر و ارادہ و عمل تمام منزلوں میں یکساں درجہ پر غلطی سے برسی یعنی معصوم ہو ایک ایسی جماعت کا ایک جگہ پمراہم ہونا خیالی دنیا میں ممکن ہے اور رکھنا ہو مگر خارجی عالم میں وقوع سے بیگانہ ہے اس لئے اس صورت پر بحث ہی کرنا بیکار ہے، جہاں تک کہ عام انسانوں کا تعلق ہے کوئی بُرے سے بُرا اور چھوٹے سے چھوٹا نظامِ اجتماعی یہاں تک کہ ایک گھر کی آبادی جو معاشرتی زندگی کی سب سے پہلی منزل ہے یہ بھی کچھ حدود و حقوق اور ان کی پابندی کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی اور اُس میں بھی ایک طاقت کی ضرورت ہے جو سب کو اُن حدود کا پابند بنائے اُسے آپ حاکم نہ کہنے گھر کا بڑا کہہ لیجئے۔

مگر یہی چیز ایک بڑے دائرے میں پہنچ کر حکومت کہلاتی ہے جس کی نوعیت میں جاسے
 جتنا بھی اختلاف کیا جائے مگر اُس کی ضرورت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔
 ارسطو نے حکومت کی تین تہیں قرار دی ہیں

اقسام حکومت

(۱) ایک شخص کی حکومت

(۲) تھوڑے محدود و معین افراد کی حکومت

(۳) بہت سے افراد کی حکومت

اور یہ واقعہ ہے کہ اُس ذات ہے اب تک وہ ہزار ہا برس گزرنے کے باوجود دنیا طح
 طرح کے تمدنی انقلابات اور نظریات کی تبدیلیوں کے باوجود ان تینوں قسموں کے دائرہ
 سے باہر نہیں نکلی ہے مگر جب ہم ان تینوں صورتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کوئی بھی ان میں سے
 عقلی اصول پر درست ثابت نہیں ہوتی۔

ایک شخص کی حکومت، اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ایک شخص میں آخر
 امتیاز کون سا ہے کہ وہ حاکم ہو جائے اور باقی سب انسان اُس کے محکوم ہوں۔
 اس کے لئے قدیم زمانہ میں سلاطین کی جانب سے یہ خیال پھیلایا گیا کہ حاکم پیدا نشی
 طور پر دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے یوں سمجھنا چاہئے کہ جیسے انسان حیوانوں میں ایک
 ممتاز ہے ویسے سلاطین کا طبقہ انسانوں میں فطری طور پر ایک نوع ممتاز ہوتا ہے کہ
 خیال غلط ثابت ہوتا ہے اُن انقلابات کو دیکھنے کے بعد جن میں سلاطین معزول ہو گئے ہیں
 اور کبھی کبھی آخر میں مقید رہے ہیں۔ بلکہ گدالی پر بچور ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے
 ایک غیر معمولی انسان ہونے کا تصور صرف اُس تخیل عظمت کی پیداوار ہوتا ہے جو عوام
 کے دماغ و دل پر اُن کی سلطنت کے دور میں استولی ہوتی ہے۔ اور اسی لئے جب وہ تخیل
 ختم ہو جاتا ہے تو وہ بالکل معمولی انسان معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اگر اُن کا امتیاز کوئی پیدا
 حق ہوتا تو وہ کبھی سلب نہ ہوتا۔ نہ اُس میں انقلاب ہوتا۔ پھر جب ہم تاریخ کا تبصرہ شلن
 پر دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ اُن میں سے اکثریت سے اوصاف میں عام انسانوں سے
 بھی بہت تھے۔ چونکہ مورخ کا قلم اکثر اُس تخیل سے خالی ہوتا ہے جو رعایا کے دل میں
 کی نسبت ہوتا ہے اس لئے وہ صاف لکھ دیتا ہے کہ فلاں بادشاہ احمق تھا۔ یا جاہل تھا۔
 یا رحمہ تھا۔ یا خود غرض تھا وغیرہ وغیرہ

دوسرا سبب جو ایک شخص کے اقتدار کے جواز کا بتایا گیا ہے وہ طاقت و اقتدار ہے اسی کو دوسری لفظوں میں قہر و غلبہ کہا جاسکتا ہے۔ یہیں قہر و غلبہ کا ذریعہ حکومت ہونا تسلیم ہے مگر معیار حقیقت ہونا کسی طرح تسلیم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے حکومت قائم ہو جاتی ہے، بالکل ٹھیک مگر قائم ہونا چاہیے بھی۔ ایسا نہیں ہے۔

بہت سی باتیں ہو چکی ہیں گرائن کا ہو جانا صحت و جواز کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک گھر کا دروازہ کھلا رہ گیا اور گھر والے بے خبر ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہے کہ چور آئیں اور سب مال لے جائیں گرائن کا یہ مال و اسباب لیجانا جائز بھی ہو یعنی وہ مجرم نہ قرار پائیں ایسا نہیں۔

اسی طرح اگر ڈاکو مسلح ہو کر حملہ کریں اور گھر کے رہنے والے یا تو اسلحہ رکھتے نہ ہوں یا تعداد میں کم ہوں تو کوئی خراب نہیں کہ وہ ڈاکو جبر و طاقت سے اُن کے مکان یا اسباب پر قبضہ کر لیں گے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دل و اسباب یا جائیداد اُن کی ملک بھی ہو جائے بلکہ دنیا کا ہر قانون اُن ڈاکو والوں کو سزا دینے اور اُن سے اُس مال کے برآء کر کے گئے گئے تیار ہو گا پھر اگر ایک مکان پر قہر و غلبہ حکمت قائم نہیں کر سکتا تو ایک ملک یا قوم پر یہ قہر و غلبہ مشرق کو چاہئے مگر قرار دے سکتا ہے۔

پھر اگر طاقت ہی سے کسی فرد نے حکومت قائم کی تو اگر رعایا طاقت حاصل کر کے اس کی مخالفت کرے تو اسے کیونکر جرم سمجھا جاسکتا ہے۔ اب اس کے بعد ایک انسان کے اقتدار اور حکومت کے لئے دوسرے انسانوں پر کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔

دوسری قسم یعنی چند انسانوں کی حکومت اس کے بارے میں بھی وہی سوال ہے یعنی ان چند آدمیوں کو حق حکومت کیونکر حاصل ہوا۔ اور جس طرح ایک شخص کی حکومت کے لئے کوئی دلیل نہیں مل سکتی اسی طرح یہ چند آدمیوں کی حکومت بھی بلا وجہ ہے۔ تیسری قسم یعنی بہت سے آدمیوں کی حکومت اس کے بارے میں سوال یہ ہے کہ بہت سے آدمی تمام قوم کا جزد ہیں یا کل قوم ہیں اگر جزد ہیں تو پھر وہی بات بحث طلب ہے کہ ان بہت سے آدمیوں کو باقی افراد پر حکومت کا حق کیا ہے اور اگر یہ کل قوم ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود پوری قوم حاکم ہے اور خود ہی محکوم تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مفاد حکومت ختم حکومت کی ضرورت تو اس لئے تھی کہ ان افراد میں جو خود غرض من مطلب پرست اور کوتاہ نظر ہیں کوئی طاقت ایسی ہو جو سب کو صحیح قانون کا پابند بنائے۔ لیکن جبکہ قانون سازی خود اس جماعت کا کام ہو گیا تو یہ اپنے مطلب کے مطابق جیسا جس وقت چاہے گی ویسا قانون بنائے گی چاہے وہ صحیح ہو چاہے غلط۔ اور اس کے نتیجہ میں مختلف جماعتوں اور مختلف افراد میں رستہ کشی ہوتی رہے گی۔ یعنی ہر ایک چاہے گا کہ اپنے مطلب کی باتوں کو تمام جامعہ کے سر منڈھ دے۔ اور اس کو ہر ایسے موقع پر بدل دینے کی کوشش کرے جبکہ اس کے مقصد کو نقصان پہنچاتا ہو۔

پھر اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ تمام جماعت کسی ایک یا چند افراد کو دستور سازی کے لئے خود مقرر کرے تو جبکہ وہ افراد ان ہی عوام کے منتخب کئے ہوئے ہیں تو ان ہی عوام کی مرضی پر چلنا ضروری ہوگا یعنی انھیں یہ لحاظ نہ ہوگا کہ صحیح و مناسب کیا ہے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ عام افراد چاہتے کیا ہیں اور اگر کبھی بھی انھوں نے رائے عامہ کی مخالفت کی تو دوسری بار کے انتخاب میں ان کے ہاتھ سے اختیارات لئے لیے جائیں گے۔ اور دوسروں کے سپرد کیے جائیں گے۔

پھر ایک بحث یہ بھی ہے کہ رائے عامہ کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ ووٹ یعنی انتخابی رائیں مگر یاد رہے کہ عوام اپنے شعور سے کام لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ بے سوچے سمجھے خواص کے ہاتھ میں ہو جاتے ہیں اور جو خواص چاہتے ہیں وہ ان سے کرا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے سمجھا جاتا ہے اکثریت کا فیصلہ وہ حقیقت میں چند افراد کی رائے ہوتی ہے جسے وہ مختلف صورتوں سے افراد قوم پر مسلط کرتے ہیں اور ان کے احکامات بے ہوشی سنگھار دیتے ہیں یہ سمجھا کر کہ یہ آپ کی رائے سے ہو رہا ہے۔

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری انتخابات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک وقت میں وہی شخص اکثریت کا قبلہ عقیدت ہوتا ہے اور دوسرے وقت وہی مخدول و منکوب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اپنے خصوصیات و اوصاف کے اعتبار سے بدلتا نہیں ہے مگر عوام کے رجحانات بدلتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام کا رجحان بھی صحت کا ذمہ دار نہیں ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ جمہوری نظام سے حاصل شدہ اقتدار بھی ایک شخص یا چند اشخاص کو ایک طرح کے قہر و غلبہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی غلبہ فوجداری اختیاروں سے حاصل کیا جائے اور کوئی غلبہ ایسے اختیاروں سے جو دماغ کو تہہ کو دیں کوئی شکنجہ ایسا ہو جس سے جہم کے مقید ہونے کا اندیشہ ہو اور کوئی شکنجہ ایسا ہو جو آزادی خیالات کو محصور کر دے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے اور صحت و حقیقت سے دونوں دور ہیں۔

معاہدہ عمرانی اور اس پر بحث

ایک نظریہ ہے "معاہدہ عمرانی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ تمام قوم کی حکومت تمام قوم پر ہے اس طرح کہ فرد اپنے اختیار سے اپنی ذاتی آزادی اور مطلق العنانی کو قربان کر دے مفاد اجتماعی کی خاطر۔ اس طرح یہ پابندی اس کے لئے بار خاطر نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ خود اپنے ہاتھ سے بخوشی اپنے ہی اجتماعی مفاد کے لئے اختیار کی گئی ہے۔ مگر اس میں سوال یہ ہے کہ جس طرح ابتداء میں یہ معاہدہ دل کی خوشی سے ہے اور اسی لئے وہ حق آزادی کے خلاف نہیں، اُسی طرح کیا بعد میں اس معاہدہ پر باقی رہنا امر اختیاری ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی یا مخالفت جرم نہ ہو جبکہ وہ شخص جس نے معاہدہ کیا تھا خود ہی اس معاہدہ کو شکستہ کر دینا چاہتا ہے اور اگر خلاف ورزی جرم ہے اور اس کے بعد معاہدہ پر برقرار رہنا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آزادی افراد کی ہمیشہ کے لئے سلب ہو گئی حالانکہ اس نظریہ کی بنیاد بقائے آزادی پر ہے۔ پھر یہ کہ جب افراد جامعہ خود معرض اور مطلب پرست ہوں تو انھیں اس کا پابند کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ قانون کی تشکیل میں اپنے مفاد شخصی کو پیش نظر نہ رکھیں اور صرف مفاد اجتماعی پر نظر ڈالیں۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے جو قانون بنے وہ مفاد عمومی کا پورے طور پر نگہبان نہیں ہو سکتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دنیا نے جتنی بھی حکومت کی شکلیں تجویز کیں ان میں سے کوئی بھی کسی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

اسلامی حکومتیں

اب اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ پھر آخر اسلام کا نظریہ حکومت کیا ہے؟ یہاں پر بعض اوقات یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریہ حکومت یعنی مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ان کا نظام۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

یہ دونوں بالکل الگ چیزیں ہیں مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ان کے متعلق بالکل غلط طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ جمہوری اصول پر نہیں مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان تمام حکومتوں میں شخصی فرمانروائی تھی جس کا اصول بھی ایک نہ تھا بلکہ کبھی ایک جلسہ میں حاکم کا انتخاب ہوا اور کبھی سابق کے حاکم نے اپنے بعد واسے کو نامزد کر دیا اور کبھی اُس نے ایک کیٹی شی مشورہ کے لئے بنادیا اور کبھی ابھر کر صرف اقتدار قائم کرنا رہ گیا جیسا ہوتا گیا دیکھ ہی اصول بنتے گئے یعنی جماع استخلافت۔ شوری۔ تہر و غلبہ۔

اب مختصر طور پر ان چاروں اصول پر تبصرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔
اجماع اس سے مراد تمام رقبہ مملکت کے افراد کا اتفاق سے یا صرف دارالسلطنت کے کل افراد کا اتفاق یا دہاں کی بھی ایک جماعت کا جو کسی خاص جگہ جمع ہو گئی ہو یا ان میں سے بھی جو متفق ہو گئے ہوں۔

اگر کل افراد عدد و مملکت مراد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان تمام افراد کی رائے کا معلوم ہونا اس زمانہ برق و بخار میں، زمانہ سیارہ و طیارہ میں کبھی میسجز کا کام ہے چہ جائیکہ اُس زمانہ میں جبکہ یہ مسائل مختاریت نہ تھے، اُس وقت میں یہ بات برسوں میں بھی حاصل ہونا مشکل تھی چہ جائے کہ اس سے کم یعنی ایک دن کا تھوڑا سا حصہ۔

پھر عقلی دود پروردہ کہتے ہیں کثیر افراد ہوں ان میں سے سب کے فیصلہ کا درست ہونا بھی اس پر موقوف ہے کہ اُس میں کوئی ایک غیر جائز اختیار یعنی معصوم مانا جائے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو جس کل کا ہر جزو غلطی کی آماجگاہ ہر وہ کل غلطی سے بڑی کیے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اور اگر صرف دارالسلطنت کے کل افراد تو انھیں حق کیا ہے کہ وہ باقی اعلان مملکت کے افراد کی آزادی کی سلب کر کے کسی حکومت کو ان پر تسلط کر دیں اس طرح کہ انھیں چون و چرا کا کوئی حق نہیں۔ اور اس سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ دارالسلطنت میں سے بھی کچھ لوگ اور وہ بھی اس شدید کشمکش و اختلاف کے ساتھ جس میں اقبالانیک کی نوبت آئے۔ پھر جبکہ یہ اجماع کسی اعلان کے ساتھ بھی نہ ہوا ہو اور اس کے لئے لوگوں کو سوچنے کا بھی موقع بالکل نہ دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ نہ جمہوری سمجھا جاسکتا ہے نہ عقلی طور پر جائز۔

اس کی صحت کے متعلق پیش کی جاتی ہے تو قرآن کی آیت اور پیغمبر کی حدیث یہ ہے کہ وہ من یثاق الرسول من بعد ما تبین لہ لہدیٰ ویقتع غیر سبیل فقرہ سے استلال کیا جاتا ہے کہ جو شخص مومنین کے راستے کے خلاف اختیار کرے وہ جہنمی ہے مگر مومنین پر تو اللہ لازم استعراقی ہے جس کے معنی کل مومنین ہیں اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلا کہ جتنے بھی مومنین ہیں جبکہ جمع ہو کر کوئی فیصلہ کر لیں وہ صحیح ہوگا۔ پھر یہ پوری آیت کا مضمون ہے بھی نہیں پوری آیت تو یہ کہہ رہی ہے کہ جو شخص رسول سے جھگڑا کرے اور مومنین کے خلاف طریقہ اختیار کرے یہ جہنم میں جائے گا اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول سے جھگڑا کرنا خود مومنین کے راستے کے خلاف ہے اور تقاضائے ایمان کے خلاف ہے۔ اس سے تو نتیجہ اور خلاف نکلتا ہے یعنی یہ کہ پیغمبر کے مقابلہ میں اُمت کو ملنے والی کاشق نہیں ہے۔

حدیث کا ترجمہ امر استی علی ضلال (یا) علی خطاء یعنی پیغمبر کا ارشاد ہے کہ میری اُمت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی یا غلطی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ حدیث سند کے اعتبار سے بالکل درست ہو تو تب بھی اس میں تمام اُمت کے اجتماع کا ذکر ہے۔ چند افراد کا جمع ہونا اس میں ہرگز نہ کوہ نہیں ہے معلوم ہوا کہ اجتماع جبرائی سے جاری حکومت قرار دیا گیا ہے اُس کی صحت پر کوئی دلیل عقلی یا نقلی نہیں ہے۔ یہ کیا استخلاص تو ظاہر ہے کہ اُس کی بنیاد ہے اُس حکمران کے حق حکومت پر جو دنیا ہے اور جبکہ اُسی کی حکومت کے جواز کا کوئی ثبوت نہیں تو استخلاص کا کیا حق اس سے قائم ہوگا۔

اس کے بعد شوریٰ وہ ساختہ و پرداختہ اُس حاکم کا ہے جو باستخلاص مبین ہوا تھا اور جس کا خود حاکم ہونا ایک ایسے حاکم کی نامزدگی سے تھا جس کی حکومت خود اپنے مال پر ثابت نہیں ہے جو حق چیر قمر و غلبہ ہے وہی طاقت حق والا نظریہ ہے جس کو پہلے غلط ثابت کیا جا چکا ہے۔ اگر انہر و غلبہ ہی معیار صحت ہے تو اس میں اسلام کی بھی شرط بلا ضرورت ہے۔ اس کے لیے کہ ان میں غلبہ داقدار حاکم ہے معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان بھی تہنا غلبہ نہ

اقتدار کو وجہ سلطنت نہیں سمجھتے بلکہ اسلام کی شرط لگاتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کھلے ہوئے کام سے اتنا شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا دشمن زیر آستین پہناں کیے ہوئے کا فریبی منافق سے۔
اب بارہ پھر یہ بحث آتی ہے کہ خود اسلام کا نظریہ حکومت کیا ہے؟
اسلام کا نظریہ حکومت یہ پہلے بیان ہو چکا کہ حکومت کے دو کام ہیں ایک دستور و

قانون کی تشکیل۔ دوسرے طاقت و اقتدار کے ساتھ اس نظام کا اجرا و نفاذ۔
اب پہلے قانون کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ اگر "اسلام" نام ہوتا صرف کچھ عقائد کا جو دماغ میں جگہ پالیں اور انھیں عمل سے تعلق نہ ہو یا کم از کم عمل سے تعلق ہوتا بھی تو صرف انفرادی زندگی میں اُسے اجتماعیات سے بحث نہ ہوتی تو بے شک یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو قانون کی تشکیل خود کرنے کی ضرورت ہو یا کسی دوسرے ملک کے قانون کی وہ پیروی کر لیں لیکن اسلام تو خود ایک دستور حیات پیش کرتا ہے جس میں صرف عقائد نہیں بلکہ زندگی کے لیے عملی ضوابط و قواعد ہیں اور وہ بھی صرف انفرادی زندگی سے متعلق نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ ایک مسلمان اسلام کو قبول کرنے کے ساتھ ہی یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ میں اپنی انفرادی و اجتماعی حیات میں اس ضابطہ و قانون کا پابند ہوں۔ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ عملی طور پر مسلم رہتے ہوئے۔ پھر خود قانون سازی کرے۔ یا کسی دوسرے شخص کے لئے قانون سازی کے حق کا قائل ہو۔ یا پوری قوم مجتہدہ طور پر قانون سازی کے کام میں شریک ہو۔ یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا جبکہ وہ مسلم ہے اور اسلام کے ساتھ ہی وہ اپنے قانون اسلام کے سرور کر چکا ہے۔

موجودہ زمانہ کے بعض مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قانون ساز کو اُس جماعت سے خارج ہونا چاہیے جس کے لئے قانون بن رہا ہے تاکہ وہ قانون زیادہ سے زیادہ بے لوث اور غیر جانبدار ہو سکے اس لئے زیادہ مناسب طریقہ یہ ہے کہ ایک ملک کے لئے قانون دوسرے ملک کے مدبرین سے بنوایا جائے، مگر یہ تو اُس وقت صحیح ہے جبکہ قانون کا دائرہ شروع ہی سے ملک یا اقلیم کے لئے ہو لیکن اگر قانون ملکوں اور قوموں کی تفریق سے بالاتر ہو یعنی تمام نوع انسانی کے لئے ہو تو پھر مذکورہ اصول کے مطابق اس کے سوا کیا صحیح ہو سکتا ہے کہ قانون نوع انسانی کی جماعت سے خارج ایک بلند ذات ہو یعنی خالق عالم جس کا علم و قدرت سب کو محیط ہے۔ یہی اسلام کا نظریہ حکومت ہے۔

نہاں قانون ساز بھی اللہ ہے اور حاکم بھی صرف اللہ ہے۔ ایک مسلم اسلام کے ساتھ ہی اُس کی اور صرف اُس کی بادشاہت کو مان لیتا ہے جس کے بعد کسی فرد کسی مجلس یا کسی قوم کا حکومت کرنا اللہ کے حق کا غصب کرنا ہے اور اس کے بعد واسطوں کی تینوں قسمیں حکومت کی ختم ہو جاتی ہیں۔ جب ایک حاکم حقیقی موجود ہے اور وہ اللہ ہے تو ایک فرد کی بھی حکومت غلط چند آدمیوں کی بھی حکومت غلط اور بہت سوں کی بھی حکومت غلط۔

اس کا نتیجہ ہے آزادی کا ل یعنی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں رہتا یا یوں کہوں کہ کسی ایسی طاقت کا محکوم نہیں رہتا جس کا دباؤ فطرت کے قیود سے باہر ہے۔ رہ گیا خالق اُس کی اطاعت فطری طور پر بہر حال کرنا ہی ہے۔

اگر ارادی افعال میں بخوشی نہ کرے گا تو اضطرابی اور فطری افعال میں جبر کرے ہی گا۔ اسی لئے ارشاد ہوا لا اسلم من فی السموات والارض طوعاً وکرہاً مگر انسان کا اثر انسانی اس کا مقفی ہے کہ وہ اس اطاعت کو با اختیار کرے تاکہ اُس کی حق شناسی کا ثبوت ملے۔ بے شک چونکہ اُس کے قانون کے معلوم کرنے کے لئے ہم الفاظ کے محتاج ہیں اور خالق کی ذات ایسی نہیں کہ وہ ہم تک پہنچ کر ہم سے بات کرے اس لیے ایک واسطہ کی ضرورت ہے یہ رسول ہے مگر اس کا کام احکام الہی کا پہنچانا ہے۔

نہ اس کا ذاتی کوئی حکم ہے اور نہ اُس کی ذاتی اطاعت ہے بلکہ جو اُس کی زبان پر آتے ہیں وہ احکام الہی ہیں۔

(وما یطق عن الہدیٰ ان ہوا الا وحی یوحی) اور جو اس کی اطاعت ہے وہ حقیقت اللہ کی اطاعت ہے (ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ) اب جبکہ حکومت اللہ کی ہے تو ہر دور میں اپنے نائب مقرر کرنا اسی کا کام ہے اور اس اختیار کو کسی وقت میں بھی اپنے ہاتھ میں لینا اللہ کے حق حکومت میں مزاحمت کرنا ہے جو ایک مسلم کے شایان شان نہیں ہے۔

قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ وما کان لمومن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امر ان ینزلوا لہم الخیرۃ من امرہم کسی مومن یا مومنہ کو اللہ اور رسول کے حکم کے سامنے اپنے معاملات کے بارے میں کوئی اختیار نہیں رہتا۔

دوسری جگہ زیادہ واضح کلیہ کی شکل میں اعلان کیا ہے وربک یخلق ما یشاء و یرید ما کان لہم الخیرۃ پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے۔

انھیں انتخاب کا حق نہیں ہے۔
 اس کے علاوہ سنت ائمہ جو قرآن مجید کے تتبع سے ظاہر ہوتی ہے، وہ یہی ہے۔ یہاں تک
 کہ اس کی طرف، حاکم اور خود اپنے لیے اس کام میں مددگار بھی خود اپنی طرف سے مقرر نہیں
 کرتا بلکہ اللہ سے دعا کرتا ہے (امری) اور محدود مقصد یعنی دشمن کے مقابلہ کیلئے
 ایک سردار بھی جو نبی یا رسول نہیں بلکہ "ملک" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے وہ بھی خود مقرر
 کر سکتی، بلکہ نبی سے خواہش کی بعثت لانا، لگانا، قتل فی سبیل اللہ اور نبی سے بھی خود مقرر
 کیا تاکہ یہ کہہ ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکاً اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر
 کیا ہے۔ پھر قوم نے اس کے آتھقان پر اعتراض کیا وہ اعتراض اور قوم کا حق مداخلت بھی تو کیا
 نہ کیا گیا بلکہ اس ذیل میں ایک کلیہ کا اعلان کر دیا گیا کہ واللہ یوتی ملکاً من یشاء اللہ
 اپنے ملک کو جسے چاہتا ہے دیتا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ حاکم حقیقی اللہ ہے تو اللہ ہی نائب
 مقرر کر سکتا ہے اور یہی نائب انسانی جماعت میں ہمارا اصلی رہنما بن سکتا ہے۔
 مسلمانوں نے اس حاکم کے انتخاب کے حق کو اللہ سے سلب کر کے اپنے ذمے کر لیا تھا
 اٹھایا یا بس معنی کہ اگر وہ اصول مقرر رہتا تو پھر وہ من و دھن کا سوال پیدا ہو کر انتشار و نہ پیدا کرنا
 دیکھ لیجئے کہ رسول کو اللہ کی طرف سے مان لیا گیا پھر ایسا تو نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں دور رسوں
 ہو جاتے، قبیلہ کو اللہ کی طرف سے مان لیا پھر یہ نہیں ہوا کہ در قبیلے ہو جاتے اور کتاب کو اللہ
 کی جانب سے مانا پھر یہ نہیں ہوا کہ دفتر آگن ہو جاتے۔ اختلافات کس اسی وقت سے پیدا ہو
 جب سے حاکم کے انتخاب کو اللہ کے بجائے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا پس اس کے بعد سے
 مسلمانوں کے شیرازہ میں انتشار پیدا ہوا تو آج تک باقی ہے۔
 چننے کا اعلان و عمل دونوں اس بار سے ہیں متحد رہے کہ حاکم کے انقرض میں رعایا کا
 نہیں۔ ایک عرب سردار نے جب اپنے اسلام لانے کی شرط یہ قرار دی کہ اپنے لیے حکومت
 میں میرا حصہ قرار دے دیکھے تو حضرت نے جواب میں صاف فرمادیا کہ اس کا نیچے اختیار
 یہ تو اللہ سے متعلق ہے۔ اب جو حضرت نے بیعت عشرہ میں حضرت علی ابن ابیطالب سے
 میں اعلان کیا کہ یہ میرا وزیر و وصی اور خلیفہ ہے تو بحیثیت مسلمان یہ ماننا لازم ہے کہ یہ حضرت
 کا اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر اعلان نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف کا اعلان ہے۔ اور اس
 سے بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ خود قوم کے اختیار سے متعلق نہیں ہے۔ دور نہ رسول

اپنے فہم نہ لیتے۔ اسی بنا پر غدیر کے خطبہ میں پیغمبر نے طاہر علی کے اعلان کے قبل پہلے مسلمانوں کے اصول تسلیم کر لیا اس استقام کے ساتھ کہ دستِ اولیٰ بکرم من انفسک قالوا بلیٰ کیا میں تم سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا ہوں سب نے کہا بیشک آپ زیادہ اختیار رکھتے ہیں۔ اب اس کو تسلیم کر لینے کے بعد تو اسی لئے رسول کی زندگی میں یہ صد کسی دہن سے بھی نکلتے نہیں سنائی دیتی کہ حکومت ہمارا حق ہے یا حاکم مقرر کرنا ہمارا کام ہے۔ اس رسول جب دنیا سے اٹھ گئے تو اب اجماع اور شوریٰ اور شر و غلبہ کا نام بھی سنائی دینے لگا۔ مگر یہ مسلمانوں کے خود ساختہ اصول ہیں۔ ان کا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

نفسہ شک حکومت کے یہ اصول جہور سلیم میں تسلیم کئے جاتے رہے۔ اور عام نظریہ یہی قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے حاکم کا تعین ہو جائے تو کسی کو مخالفت کا حق نہیں اور اگر کوئی مخالفت کرے اور حاکم اس کے خلاف تاویسی مہم جاری کرے۔ تو حاکم کا فعل درست اور جو شخص اُس کے خلاف ہو وہ مجرم اور اگر اس سلسلہ میں قتل ہو جائے تو گمراہی کے ساتھ ہلاک شدہ سمجھا جائے گا۔ شہید اُسے نہیں کہا جاسکتا۔

یہ اب تک علم و آراء تھا جس کے شواہد تاریخ میں بہت ہیں اسیر شام معاویہ نے اپنے فرزند یزید کے لئے نہ صرف ان طریقوں میں سے کوئی ایک بلکہ ان تمام طریقوں کو جمع کر دیا۔ انھوں نے شام اور عراق کے علاوہ مکہ اور مدینہ میں خود جا کر جلسے کیے اور یزید کو بیعت لی۔ اس طرح جتنا بڑا اجماع یزید کی خلافت پر ہوا ایسا اس کے پہلے کسی خلیفہ میں نہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اختلاف بھی تھا اور تہر و غلبہ بھی اس کا نتیجہ صاف ہے کہ کسی شخص کو مخالفت کا حق نہ ہونا چاہیے۔ اور مخالفت کرے تو بادشاہ کو اُس کے خلاف کارروائی کا حق اور وہ اگر قتل ہو جائے تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں۔

حضرت حسین ابن علی کا یہ کارنامہ تھا کہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اس بادشاہ کے مقابلہ کے لیے اور پھر اپنے ساتھ بے گناہی اور مظلومیت کی طاقت کو ایسا زبردست بنادیا کہ حسین کو مظلوم اور یزید کو ظالم ماننے پر مجبور ہوئی۔ حسین اور ان کے ساتھی سب شہید ہو گئے اور یزید ہمیشہ کے لئے مردود ملعون قرار دیا گیا اس طرح حسین نے اُس حکومت کا ختم الٹ دیا جو اسلامی نظریہ کے خلاف مسلمانوں میں غلط طرز پر مان لیا گیا تھا۔

۱۴
مسلمانوں کا نظریہ حکومت مادی اسباب یعنی عوام کے اتفاق برائے انتخاب
یا حصول تاج و تخت کا محتاج ہے مگر اسلامی نظریہ حکومت ان اسباب کا محتاج نہیں
ہے۔ تمام دنیا انکار کر رہی ہو مخالفت پر کمر بستہ ہو بلکہ قتل پر تیار ہو، گوشہ نشینی و
کس مہتری ہو، پیوند دار لباس اور فرش حصیر ہو لیکن اگر وہ اسلامی قانون کا سب سے
بڑا واقف کار اور سب سے بڑا عمل پیرا اور اس کے محافظ ہونے کا اہل ہے اور اللہ
کی طرف سے اس منصب پر مقرر ہوا ہے تو وہ "الہی حاکم ہے" اور دنیا پر اُس کی اطاعت
فرض ہے اور جو حکومت الہیہ کے ماننے والے ہیں وہ اسی کو اپنا حاکم تسلیم کرتے رہیں گے
اور جو بھی دنیا کا حاکم اپنے مادی اقتدار کی بنا پر تسلط قائم کرے گا اُسے ہمیشہ غاصب سمجھیں گے
چاہے وہ حکمران ظاہری طور پر اپنے کو مسلمان بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اُس فرقہ کا پیر دہانا
ہو جس میں حکومت الہیہ کے نظام کو تسلیم کیا جاتا ہے یا درکھنا چاہیے کہ حکومت الہیہ کا ایک پیر
کبھی کسی طاقت کا محکوم نہیں ہو سکتا یعنی اگر حالات کی نامساعدت سے وہ کسی دوسرے نظام
اقتدار کے شکنجہ میں اسیر بھی ہوگا تو ہمیشہ اس پر نظر رکھے گا کہ اللہ کا حکم اُس کی نسبت کیا
اگر اُس نے یہ محسوس کیا کہ ان حالات میں حفاظت جان و مال یا کسی بلند مقصد کے تحفظ
کی خاطر حکم الہی ہی ہے کہ میں خاموشی کے ساتھ قانون سلطنت پر عمل کرنا چاہیے تو وہ عمل
کرتے گا جسے دنیا سمجھے کہ وہ حکومت وقت کے احکام کی اطاعت ہے مگر حقیقت میں اسے
حاکم اصلی اللہ کی اطاعت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہے۔ یہ اور بات ہے
اتفاق سے نتیجہ اُس کا حاکم وقت کے قانون کی پیروی کے مطابق ہو گیا ہے لیکن اگر
اپنے حاکم اللہ کا یہ نشانہ دیکھ لے گا کہ ان حالات میں پیروی جائز نہیں ہے تو وہ
دینا گوارا کرے گا گھر کا برباد ہونا قبول کرے گا مگر جہاد کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔
اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی روح کبھی غلام نہیں بنائی جاسکتی۔
اس لیے تو حکومت الہیہ کی اصل حقیقت

حکومت آئینہ کے قیام کی و شوری

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی روح بھی صاف
 اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی روح بھی صاف
 حکومت الہیہ کے قیام کی دشواری جو ہر انسان کی انفرادی زندگی
 بھی کار فرما ہے لیکن جہاں تک اس کے ظاہری اقتدار کا تعلق ہے وہ افراد عام
 وجود پر موقوف ہے۔ اور اگر صالح افراد اتنی تعداد میں نہ موجود ہوں تو وہ نائب
 وجود پر موقوف ہے۔ اور اگر صالح افراد اتنی تعداد میں نہ موجود ہوں تو وہ نائب

تسلیم نہ کرے گی اور اُسے گوشہ نشین ہو جانا پڑے گا اور یہ سلسلہ ۲۶۰ برس تک جاری رہے گا جو اس کے تجربہ کے لیے کافی ہے کہ افراد صالحہ کا فقدان حکومت الہیہ کے ظاہری طور پر برسر اقتدار آنے میں مانع ہے لہذا اگر اس کے بعد نائب خاص ہماری نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو اس کا سبب افراد کی عدم صلاحیت ہی قرار پائے گی۔ یہ کہنا درست نہ ہو گا کہ جب حکمران غائب ہے تو حکومت کیسے قائم ہو۔ یقیناً اگر اس وقت افراد صالحہ پیدا ہو جائیں تو حاکم حقیقی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے نائب کو ہمارے سامنے ظاہر کر دے۔

جبکہ ایسا نہیں ہے تو موجودہ حالات میں حکومت الہیہ کے برسر اقتدار آنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

یوں نظری حیثیت سے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت یہ حق حکام شرع یعنی علمائے دین کا ہے مگر موجودہ مادی رجحانات کی رو میں ہیں یقین ہے کہ اگر اس طرح کی تشکیل کا ارادہ کیا جائے تو خود اُس طبقہ میں جو منصب حکومت کا اہل سمجھا جائے بہت سے افراد برسر اقتدار آنے کی کوشش کریں گے جو شاید اس کے اہل نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ نتیجہ میں وہ حکومت بھی حکومت الہیہ نہ ہوگی چاہے وہ حکومت شرع کے نام سے قائم کی گئی ہو۔ صرف اس لیے کہ افراد صالحہ ہمارے علم میں نایاب ہیں اور ہوں تو یقیناً گوشہ ہائے گمنامی میں ہیں جن کا تعارف بھی دُنیا کو نہیں ہے ایسی صورت میں یقین سمجھنا چاہیے کہ جو بھی حکومت قائم ہوگی وہ "غیر الہیہ" ہی ہوگی۔ چاہے وہ فرد کی ہو اور چاہے اپنوں کی ہو لیکن حکومت الہیہ کے علاوہ کسی اقتدار کسی تنظیم کسی ادارہ سے غیر مشروط معاہدہ تعاون یا بیعت کسی طرح جائز نہیں جبکہ اللہ کے نام پر معاہدہ کیے ہوئے ہیں کہ ہیں اُس کے احکام پر عمل کرنا ہے تو کسی جماعت کے عمل کو ہم غیر مقید طریقہ پر کیسے قبول کر سکتے ہیں جبکہ یہ ممکن ہے کہ اُس نظام عمل میں ایسی صورتیں پیدا ہوں کہ حکومت الہیہ کے احکام کی تعمیل میں اُس کی مخالفت لازم ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ہر حکومت کے ساتھ امن عام کی خاطر تعاون کرنا لازم ہے مگر آزاد رہ کر یعنی خود اپنے فرض کے احساس سے صحیح طریقہ عمل کو معلوم کر کے۔

لیکن کسی جماعت کے طریقہ کا پابند ہو کر عمل کرنا یہ حکومت اسی کی پابندی کے
مٹانی اور جہاد سے ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت کے خلاف ہے۔ والسلام



پبلشر
سید ابن حسین نقوی آنریری سکریٹری
امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ
منبر از قومی پریس لکھنؤ